ڈاکٹر افضل اقبال
ترجمہ: بشیر محمود اختر

حیات وکائنات کی ماہیت

(رومی کے نقطۂ نظر سے)

رومی کہتا ہے، دنیا ایک خیال ہے جو آفاقی عقل سے صادر ہو رہا ہے۔ یہ عقل ایک بادشاہ کی طرح ہے اور خیالات اس کے سفیر ہیں۔ پہلی دنیا آزمائش کی دنیا ہے، دوسری مکافات کی۔ اگر کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو یہ واقعہ حقیقت بن جاتا ہے اور زنجیر و زندان کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، اور اگر کوئی شخص نیکی کا کام کرتا ہے تو وہ اس کے لیے وجہِ امتیاز بن جاتا ہے۔ اس واقعے اور حقیقت کا معاملہ انڈے اور مرغی کا سا معاملہ ہے۔ انڈے سے مرغی برآمد ہوتی ہے اور مرغی انڈے دیتی ہے، اور اس طرح یہ سلسلہ چلتا جاتا ہے۔ آخر ہماری زندگی کے یہ واقعات حقیقت کا روپ کیوں نہیں دھار لیتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکمتِ ربانی نے انھیں اخفا میں رکھا ہے تاکہ خیر و شر کی یہ دنیا ایک سربستہ راز رہے، کیونکہ اگر خیال کے اصل اسالیب عیاں ہو جاتے تو پھر ہماری یہ دنیا قیامت ہی کی طرح ہوتی اور قیامت میں بھلا کوئی نیکی یا بدی کا ارتکاب کر سکتا ہے؟ بہرحال اللہ تعالیٰ نے بدی کی پاداش عوام الناس ہی سے پوشیدہ رکھی ہے، اپنے برگزیدہ بندوں سے نہیں:

حق بمن بنمود پس پاداشِ کار   وز صور ہائے عملہا صد ہزار   (دوم: ۹۹۱)

زندگی پیہم عمل کا نام ہے، کوئی شخص لمحے بھر کے لیے بھی بے کار نہیں رہ سکتا۔ عمل کی لگن کا مقصود یہ ہے کہ ہمارا داخلی شعور نمایاں طور پر جلوہ گر ہو سکے:

یک زماں بیکار نتوانی نشست   تا بدی یا نیکی از تو بر نجست

ایں تقاضا ہائے کار از بہر آں   شد موکل تا شود سرت عیاں

. . . .   پس تو بیکاری بود چوں جاں کنش

ایں جہان و آں جہاں زاید ابد   ہر سبب مادر اثر از وے ولد

چوں اثر زائید آں ہم شد سبب   تا بزائید او اثر ہائے عجب

ایں سبب ہانس برلسلت لیک   دیدہ باید منور نیک نیک (دوم: ۹۹۶-۱۰۰۲)

یہ کائنات اسباب کا ایک سلسلہ ہے۔ ہر سبب چونکہ ماہیت بھی ہے اور صورت بھی (اور دونوں غیر منفک ہیں) - اس لیے وہ علّت بھی ہوتا ہے اور نتیجہ بھی، عامل بھی اور معمول بھی، اسی طرح ہر نتیجہ ماہیت اور صورت ہونے کے سبب علت بھی ہوتا ہے اور نتیجہ بھی۔ حقیقت چونکہ ایک ہی ہے، جسے کبھی ماہیت سمجھا جاتا ہے اور کبھی صورت، اس لیے یہ بہ یک وقت علّت بھی ہے اور نتیجہ بھی۔ ہر شے جو کسی دوسری شے سے اتفاقی رابطہ قائم ہو جانے کے سبب علّت کہلاتی ہے جسے ہم نتیجہ کہتے ہیں، بہ یک وقت اپنے نتیجے کا نتیجہ ہے۔ اس نتیجے کی وجہ سے وہ اپنی ماہیت میں ایک علّت ہے۔ مراد اس سے یہ ہوتی کہ خدا جو واحد علت ہے، علل اور نتائج ہیں محیطِ کل ہے۔ یہ بات بالکل غیر اہم ہے کہ ہم کسی خاص علّت کو کسی خاص نتیجے کی علّت کہیں یا اس نتیجے کا نتیجہ (جو خود علت متصور ہوتا ہے)۔ علّیت کا یہ تصور "ہونے" کی تمام حرکات پر اہم اثر ڈالتا ہے کیونکہ سب مخلوقات "ہونے" ہی کی کوشش میں ہیں۔ کائنات کا ذرّہ ذرّہ اپنے اظہار کے لیے بے تاب ہے:

آسماں گوید زمیں را مرحبا   با توام چوں آہن و آہن ربا
آسماں مرد و زمیں زن در خرد   ہرچہ آں انداخت ایں می پرورد
پس زمین و چرخ را داں ہوشمند   چونکہ کار ہوشمنداں می کنند
گر نہ از ہم ایں دو دلبر می مزند   پس چرا چوں جفت در ہم می خزند
بے زمیں کے گل بروید و ارغواں   پس چہ زاید ز آب و تاب آسماں
بہر آں میل است در مادہ بہ نر   تا بود تکمیل کار ہمدگر
میل اندر مرد و زن حق زاں نہاد   تا بقا یابد جہاں زیں اتحاد
میل ہر جزوے بجزوے ہم نہد   ز اتحاد ہر دو تولیدے زہد
شب چنیں با روز اندر اعتناق   مختلف در صورت اما اتفاق (سوم: ۴۴۰۳-۴۴۱۷)

بہت سے صوفیا نو فلاطونی انداز فکر میں کائنات کو خدائے واحد قادر مطلق سے ظہور کے سلسلے کی ایک چیز سمجھتے ہیں۔ اس خیال کے مطابق ہر سلسلہ وار مرحلہ اپنے سے بلند تر مرحلے کا مظہر ہوتا ہے اور

اس طرح رفتہ رفتہ حقیقت سے دُور تر ہوتا جاتا ہے۔ اکثر شارحین نے مثنوی کی تشریح وحدت الوجود کے نظریے کے مطابق کی ہے جسے ابن العربی سے منسوب کیا جاتا ہے، لیکن اس طرح رومی سے بڑی ناانصافی ہوتی ہے، وہ بنیادی طور پر ایک شاعر اور صوفی ہے، فلسفی یا منطقی نہیں۔ رومی کا عقیدہ ہے کہ ہر شے اپنے اصل سرچشمے تک پہنچنے کی جدوجہد کر رہی ہے:

میلِ تن در سبزہ و آبِ رواں — زاں بود کہ اصلِ او آمد ازاں
میلِ جاں اندر حیات و در حی است — زاں کہ جاں لامکاں اصلِ وی است
میلِ جاں در حکمت است و در علوم — میلِ تن در باغ و راغ و در کروم
میلِ جاں اندر ترقی و شرف — میلِ تن در کسبِ اسباب و علف
میل و عشقِ آں شرف ہم سوئے جاں — زیں یحبہم یحبون را بداں
گر بگویم شرح ایں بے حد شود — مثنوی ہفتاد من کاغذ شود
آدمی حیواں نباتے و جماد — ہر مراد عاشقِ ہر بے مراد
بے مراداں بر مرادے می تنند — واں مراداں جذب ایشاں می کنند
لیک میلِ عاشقاں لاغر کند — میلِ معشوقاں خوش و بافر کند
عشقِ معشوقاں دو رخ افروختہ — عشقِ عاشق جانِ او را سوختہ (سوم: ۴۴۳۵-۴۵)

ہر شے تو اپنی اصل کی طرف لوٹنے کی کوشش میں ہے، لیکن کوئی اصل اپنے ماحصل کی ہم صورت نہیں ہوتی

نطفہ از ناں است کے ماند بناں — مردم از نطفہ است کے باشد چناں
جنّے از نار است کے ماند بنار — از بخار است ابر کے ماند بخار
از دمِ جبرئیل شد عیسیٰ پدید — کے بصورت ہمچو او شد ناپدید
آدم از خاک است کے ماند بخاک — ہیچ انگورے نمی ماند بتاک (پنجم: ۳۹۸۰-۸۵)

اس کائنات کے مختلف اجزا میں شدید تصادم کی کیفیت موجود ہے۔ چار عناصر کو لیجیے، ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے تباہ کن ہے:

چار عنصر چار استونِ قوی است — کہ بدیشاں سقفِ دنیا مستوی است
ہر ستونے اشکنندہ آں دگر — استنِ آب اشکنندہ ہر شرر

پس بنائے خلق بر اضداد بود — لاجرم جنگے شدند از ضر و سود (ششم: ۴۵-۵۰)

یہ تصادم انسانی ذہن سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ذہن اور جسم کی کیفیات باہم دگر مختلف ہیں، انسان اپنے آپ سے باہم برسرِ پیکار ہے، اس کے اندر ہی اندر ایک جنگ جاری ہے:

ایں تفانی از ضد آید ضد را — چون نباشد ضد نبود جز بقا

نفی ضد کرد از بہشت بے نظیر — کہ نباشد شمس و ضدش زمہریر (ششم: ۵۶-۵۷)

راسخ العقیدہ مسلمان کہتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ موازنے سے بالاتر ہے۔ وہ اپنی وحدتِ کاملہ میں تمام مخلوقات سے جدا اور ماورا ہے اور اس کے جو اوصاف قرآنِ حکیم میں درج ہیں، انھیں ان معنوں میں نہیں لینا چاہیے جن معنوں میں انھیں اس کی مخلوقات میں سے کسی پر منطبق کیا جاتا ہے۔ وحدت الوجودی صوفیا جو نظریۂ تنزیہہ کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بات پوری حقیقت کو ظاہر نہیں کرتی، ان کی رائے میں پوری حقیقت، تنزیہہ اور تشبیہ کے امتزاج سے واضح ہوتی ہے، اوّل الذکر نظریہ تو خود خداوند تعالیٰ اور دنیا کی ثنویت کی طرف لے جاتا ہے اور آخر الذکر بذاتِ خود کثرتِ الٰہ کا عقیدہ ہے۔ رومی، عقل کی خفاش صفت آنکھ اور دل کی آنکھ کا موازنہ کرتا ہے کہ ظاہری حس ظلمت کی طرف لے جاتی ہے اور باطنی حس معرفت کی راہ باز کرتی ہے:

حسِ خفاشت سوئے مغرب دواں — حسِ درپاشت سوئے مشرق رواں (دوم: ۴۷)

وہ کہتا ہے کہ جو لوگ روحانی اشیا سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں بالکل معتزلیوں کی طرح ہیں۔ اور معتزلہ وہ فلاسفہ تھے جو کہتے تھے کہ ایمان داروں کے لیے اس دنیا یا اگلی دنیا میں اللہ تعالیٰ کے دیدار کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن رومی کا عقیدہ ہے کہ ایمان دار اس دنیا میں بھی اور بہشت میں بھی اللہ تعالیٰ کے دیدار سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ بہشت، دوزخ اور قیامت کا بلاواسطہ مشاہدہ اس دنیا میں بھی ممکن ہے۔ رومی کہتا ہے کہ جب تک تم اپنے حواس کے مقید رہوگے، معتزلی ہی رہوگے:

ہر کہ در حس ماند او معتزلیست — گرچہ گوید سنیم از خامیست

ہر کہ از حس خدا دید آیتے — در بر حق ہست بہتر طاعتے (دوم: ۶۸-۶۹)

کثرت کا ظہور روحِ حیوانی سے ہوا کرتا ہے جو حسیات کی آلۂ کار ہے۔ (۲)

انسانی روح وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ میں پھونکی تھی۔[1] اور وہ انسانِ کامل کی روح ہے۔ یہ لازماً واحد اور ناقابلِ تقسیم ہے۔ لہٰذا انبیا اور اولیا جو نفسانی میلانات سے منزّہ ہوتے ہیں، روحاً ایک ہیں، گو اپنے خصوصی اوصاف کی وجہ سے انھیں ایک دوسرے پر امتیاز حاصل ہو:

تفرقہ در روحِ حیوانی بود   نفسِ واحد روحِ انسانی بود (اوّل: ۳۲۰، دوم ۱۸۸)

عالمِ خلق کی مختلف سمتیں اور جہتیں ہوتی ہیں لیکن عالمِ امر و صفات بے جہت ہے:

بے جہت داں عالمِ امر و صفات   عالمِ خلقست با سوی و جہات
بے جہت داں عالمِ امر اے صنم   بے جہت تر باشد امر لاجرم
بے تعلق نیست مخلوقے بدو   آں تعلق ہست بیچوں اے عمو
زانکہ فصل و وصل نبود در رواں   غیرِ فصل و وصل نیندیشد گماں (چہارم: ۳۶۹۲-۳۶۹۶)

عقل اس حقیقت کا قطعاً سراغ نہیں پا سکتی کیونکہ وہ تو اپنی ہی مقرر کردہ حدوں کی پابند ہوتی ہے:

ایں تعلق را خرد چوں پے برد   بستۂ فصلت و وصلت ایں خرد
زیں وصیت کرد مارا مصطفیٰؐ   بحث کم جوئید در ذاتِ خدا (چہارم: ۳۶۹۹-۳۷۰۰)

رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ تفکروا فی آلاء اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ۔ (یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر غور کرو اور اللہ تعالیٰ کی ذات میں فکر مت کرو۔

دفترِ پنجم کی ایک نظم میں رومی اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہے:

قدرِ تو بگذشت از درکِ عقول   عقل در شرحِ شما شد بوالفضول
گرچہ عاجز آمد ایں عقل از بیاں   عاجزانہ جنبشے باید دراں
اِنّ شیئاً کلّہ لا یُدرَک   اعلموا انّ کلّہ لا یُترَک
گرچہ نتواں خورد طوفانِ سحاب   کے تواں کردن بترکِ خوردِ آب
آبِ دریا را اگر نتواں کشید   ہم بقدرِ تشنگی باید چشید
راز را گر مے نیاری درمیاں   درکِ ما را تازہ کن در قشرِ آں (پنجم: [illegible])

---

[1] نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ - سورۃ الحجر، ۲۹

جو شخص خواب دیکھتا ہے وہ دوسروں سے منفرد اور الگ ہوتا ہے، وہ اپنے الفاظ کو خواب کا جامہ نہیں پہنا سکتا اور اس کے لیے اپنے تجربے کا اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ رسولِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام جب جبرئیل کو پیچھے چھوڑ کر انتہائی بلند مقام پر تشریف لے گئے تو اس موقع کے لیے قرآن میں صرف اسی قدر بیان کیا گیا ہے :

فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ مآ اوحیٰ۔ (النجم : ۱۰)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر وحی نازل فرمائی جو کچھ نازل فرمائی تھی۔

وہاں جو کچھ انھوں نے دیکھا بیان نہیں کیا گیا، دراصل ان کیفیات کا بیان الفاظ کی حدود سے ماورا ہے، ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے جب خاموشی خوش بیانی کا درجہ کمال بن جاتی ہے، تاہم ہم مستعار معلومات پر اکتفا نہیں کر سکتے، ہمیں تو خود وہ منفرد اور ناقابلِ اظہار خواب دیکھنے کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ دوسروں کی نظر اور نور مستعار سے دیکھنا ہمارے لیے نہایت مضر ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم اس نظر اور نور کو اپنا سمجھتے ہیں۔

رومی اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہے کہ خدایا! اس باغ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی کہ اس کا خوبصورت خلعت اس سے چھن گیا اور خزاں نے اسے زیر وزبر کر دیا، جواب ملا کہ جرم تو یہ ہے کہ مستعار زیور پہن کر یہ دعویٰ کیا گیا کہ یہ میری ملک ہے :

جرمش آنکہ زیور عاریہ بست | کرد دعویٰ ایں حلل ملک من است
واستانیم آنکہ تا داند یقین | خرمن آں ماست خوباں خوشہ چیں
تا بداند کاں حلل عاریہ بود | پرتوے بود او ز خورشید وجود
قاسئے یا دانشے آموختہ | وز چراغ غیر چشم افروختہ
او چراغ خویش بربایدکہ تا | تو بدانی مستعیری اے فتی (دفتر پنجم: ۹۶۹-۹۹۳)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک نقش بنا کر اس میں بگاڑ کا مادہ رکھ دینے کا کیا مقصد تھا؟ کیا تخریب تعمیر کا پیش خیمہ ہے؟ اس کا جواب رومی یوں دیتا ہے :

لوح را اول بشوید بیوقوف | انگہے بروے نویسد آں حروف
خوں کند دل را ز اشک مستہاں | بر نویسد بروے اسرار انگہاں ...

چوں اساسِ خانہ تو افگنند   اولیں بنیاد را بر میکنند
گل برآرند اوّل از قعرِ زمیں   تا بآخر برکشی ماءِ معیں   (دفتر دوم)

اس دائمی کشمکش کا اظہار انسان کی تخلیق کی صورت میں رونما ہوتا ہے - اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے انتہا پاکیزگی بخشی، پھر اس کا ایک مدِمقابل پیدا کر دیا اور دو نشان مقرر فرمائے، ایک سفید اور ایک سیاہ، ایک طرف حضرت آدمؑ تھے اور دوسری طرف ابلیس - بعد ازاں ہابیل نمودار ہوا - اور اس کے مقابلے میں قابیل روشنی اور پاکیزگی کا حریف ثابت ہوا - پھر نمرود کا زمانہ آیا جو حضرت ابراہیم کی مخالفت پر کمربستہ ہو گیا - اسی طرح یہ سلسلہ فرعون اور حضرت موسیٰ تک پہنچا حتیٰ کہ حضور اکرم محمد مصطفےٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ابوجہل کا زمانہ آیا اور یہ آویزش آج بھی جاری ہے

ہر گیاہ را کش بود میل علا   در مزیدست و حیاتست و نما
چونکہ گردانید سر سوئے زمیں   در کمی و خشکی و نقص و غبیں
میل روحت چوں سوئے بالا بود   در تزاید مرجعت آں جا بود
در نگوں ساری سیرت سوئے زمیں   آفلی حق لا احب الآفلیں (دوم: ۱۸۱۲-۱۸۱۵)

انسان کو اپنی موجودہ منزل تک پہنچنے کے لیے اموات کے کئی سلسلوں سے گزرنا پڑا ہے ہموت نے اس کو ہمیشہ اعلیٰ تر مرتبہ عطا کیا ہے، اب وہ موت سے بھلا کیوں خوف زدہ ہو ؟

از جمادے مردم و نامی شدم   وز نما مردم بہ حیواں برزدم
مردم از حیوانے و آدم شدم   پس چہ ترسم کے زمردن کم شدم
حملۂ دیگر بمیرم از بشر   تا برآرم از ملائک پر و سر
وز ملک ہم بایدم جستن زجو   کل شیئ ہالک الا وجہہ
بار دیگر از ملک قرباں شوم   آنچہ اندر وہم ناید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں   گویدم کہ انا الیہ راجعون (سوم: ۳۹۰۱-۳۹۰۶)

یہی جذبۂ ایمان انسان کے دل سے موت کا خوف مٹا دیتا ہے، پھر وہ خطرات میں گھر کر بھی زندہ رہنا جان لیتا ہے، وہ ایک سیلانی کی طرح بے خوف و خطر رواں دواں رہتا ہے، جیسے وہ موت کا تعاقب کر رہا ہو:

منبلے نے کو بکف پول آورد — منبلے چستے کز یں پل بگذرد
آں نہ کو بر ہر دکانے بر زند — بل جہداں کون و کانے بر زند
مرگِ شیریں گشت و نقلم زیں سرا — چوں قفس ہشتن پریدن مرغ را (سوم: ۳۹۴۹-۳۹۵۱)

انسان اپنی ہیئت میں تو ایک کائناتِ اصغر ہے لیکن درحقیقت وہ بجائے خود ایک عالمِ اکبر ہے:

پس بصورت عالمِ اصغر توئی — پس بمعنی عالمِ اکبر توئی
ظاہراً آں شاخ اصلِ میوہ است — باطناً بہرِ ثمر شد شاخ ہست
گر نبودے میل و امید ثمر — کے نشاندے باغباں بیخ شجر
پس بمعنی آں شجر از میوہ زاد — گر بصورت از شجر بود ش نہاد
اول فکر آخر آمد در عمل — خاصہ فکرے کو بود وصفِ ازل (چہارم: ۵۲۰-۵۳۰)

رومی مخلوقات کو تین گروہوں میں تقسیم کرتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے فرشتے تخلیق کیے اور انھیں عقل بخشی، حیوانات میں شہوت کا مادہ پیدا کیا، بنی آدم کو عقل اور شہوت دونوں عطا فرمائے۔ پہلا گروہ تو سراسر عقل و علم اور خیر ہے، فرشتہ نورِ مطلق ہے اور عشقِ خدا میں زندہ ہے، اس لیے وہ ہر طرح کے تصادم سے محفوظ ہے۔ دوسرا گروہ علم سے یکسر محروم ہے اور وہ بھی اس تناؤ اور دباؤ سے آزاد ہے جس میں انسان مبتلا ہے۔ انسان نصف فرشتہ ہے اور نصف حیوان۔ فرشتے اور حیوان کشاکش سے محروم ہیں لیکن انسان اپنے مخالفین سے جنگ و پیکار کے سبب حالتِ کرب میں ہے:

پھر انسانوں کے بھی تین طبقے ہیں:

۱- ایک طبقہ تو مستغرقِ مطلق ہے اور حضرت عیسیٰ کی طرح فرشتوں سے ملحق، صورت میں آدم لیکن حقیقت میں جبرئیل، وہ غصے، ہوا و ہوس اور قیل و قال سے آزاد ہے:

یک گروہ مستغرقِ مطلق شدہ — ہمچو عیسیٰ با ملک ملحق شدہ
نقشِ آدمؑ لیک معنی جبرئیل — رستہ از خشم و ہوا و قال و قیل

یعنی پیغمبروں کا مقام فرشتوں سے بھی بلند تر ہے۔

۲- دوسرا طبقہ جو حیوانوں (گدھوں) سے ملحق ہوا، اس میں غصے اور شہوت کا غلبہ ہے:

قسمِ دیگر با خراں ملحق شدند — خشمِ محض و شہوتِ مطلق شدند

۳۔ تیسرا طبقہ جس میں نصف حیوانیت ہے اور نصف روحانیت، اس کا نصف تو لذائذ دنیا کی طرف کھینچتا ہے اور نصف اللہ کی طرف، یہ کش مکش دن رات جاری ہے :

ماند یک قسم دگر در اجتہاد　　　نیم حیواں نیم حی با رشاد
روز و شب در جنگ اندر کشمکش　　　کردہ چالش اولش با آخرش　(چہارم: ۱۴۹۸-۱۵۲۲)

اس طرح ہم وہ نصف انسان ٹھہرتے ہیں جو مکمل انسان کی جستجو میں ہیں، لہٰذا ہمیں ایک عاقلِ کامل کی تلاش کرنی چاہیے اور اُسے یوں پکڑنا چاہیے جیسے ایک اندھا اپنے رہنما کو پکڑتا ہے :

دیگرے کہ نیم عاقل آمد او　　　عاقلے را دیدہ کرد آں نورجو
دست در وے زد چو کور اندر دلیل　　　تا بدو بینا شد و چست و جلیل　(چہارم: ۲۱۸۸-۱۹۸)

اور مکمل انسان تو ایک ولی ہوتا ہے جس کا نقش ایک شفاف آئینے کی طرح جلوہ گر ہوتا ہے :

نقشِ او فانی و او شد آئینہ　　　غیر نقشِ روے غیر آں جائے نہ
گر کنی تف سوئے روے خود کنی　　　ور زنی بر آئینہ بر خود زنی
ور بہ بینی روئے زشت آنہم توئی　　　ور بہ بینی عیسیٰ بن مریم توئی
او نہ اینست و نہ آں او سادہ است　　　نقش تو در پیش تو بنہادہ است　(چہارم: ۲۱۴۰-۱۴۳)

ولی سادہ اور نیک طبع ہوتا ہے، وہ آپ کا نقش بعینہٖ آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے :

انسان آبِ دریا کی طرح ہے، جب اس کا پانی گدلا ہو جاتا ہے تو اس کی تہہ نظر نہیں آ سکتی اور دریا کی تہہ میں ہیرے جواہرات کی فراوانی ہوتی ہے۔ رومی ہدایت کرتا ہے کہ ہوش مندی سے کام لو اور پانی کو گدلا مت کرو کیونکہ یہ پانی تو اپنی اصل میں پاک اور شفاف ہوتا ہے۔ انسان کی روح ہوا سے مشابہ ہوتی ہے۔ جب ہوا میں گرد و غبار شامل ہو جاتا ہے تو یہ آسمان کو اپنے پردے میں چھپا لیتی ہے اور سورج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور جب گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے تو ہوا پھر صاف اور پاکیزہ ہو جاتی ہے :

رومی ایک حکایت بیان کرتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے خداوند تعالیٰ سے سوال کیا تھا کہ آپ طرح طرح کی صورتیں بناتے ہیں، پھر انھیں بگاڑتے کیوں ہیں؟

گفت موسیٰؑ اے خداوندِ حساب　　　نقش کردی باز چوں کردی خراب

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو زمین میں ایک بیج بونے کے لیے کہا تاکہ وہ خود مشاہدہ کر سکیں اور انصاف کی داد دے سکیں:

موسیا! تخمے بکار اندر زمین — تا تو خود ہم داد ہی انصاف ایں
چونکہ موسیٰ کشت شد کشتش تمام — خوشہایش یافت خوبی و نظام
داس بگرفت و مر آنہا را برید — پس ندا از غیب در گوشش رسید
کہ چرا کشتے کنی و پروری — چوں کمالے یافت آں را ہبری
گفت یارب زاں کنم ویران و پست — کہ دریں جا دانہ ہست و کاہ ہست
دانہ لائق نیست در انبار کاہ — کاہ در انبار گندم ہم تباہ

اس حکایت سے یہ سبق حاصل ہوتا ہے کہ مخلوقات میں پاکیزہ روحیں بھی ہوتی ہیں اور سیاہ اور کثیف بھی:

در خلائق روح ہائے پاک ہست — روح ہائے تیرہ و گلناک ہست
ایں صدف ہا نیست در یک مرتبہ — در یکے درست و در دیگر شبہ
بہر اظہار ست ایں خلق جہاں — تا نماند گنج حکمت ہا نہاں
کنت کنزاً گفت مخفیاً شنو — جوہر خود گم مکن اظہار شو (چہارم: ۳۰۰۰-۳۰۲۹)

انسان کے روحانی عروج کی کہانی نہایت دلپذیر ہے۔ وہ پہلے پہل اقلیم جماد میں آیا جہاں سے گزر کر اقلیم نبات میں پہنچا، وہاں کئی برسوں تک مقیم رہا، یہاں وہ اقلیم جماد کو بھول گیا کیونکہ دونوں اقلیموں میں بڑا اختلاف ہے:

وز نباتے چوں بہ حیواں او فتاد — نامدش حال نباتے ہیچ یاد
باز از حیواں سوئے انسانیش — میکشد آں خالقے کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت — تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقل ہائے اولینش یاد نیست — ہم ازیں عقلش تحول کردنیست
تا رہد زیں عقل پُر حرص و طلب — صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب
گرچہ خفتہ گشت و ناسی شد زپیش — کے گزارندش دراں نسیان خویش

ہم چنیں دنیا کہ حلم نائمست — خفتہ پندارد کہ ایں خود قائمست
تا برآمد ناگہاں صبحِ اجل — وارہد از ظلمتِ ظن و دغل (چہارم: ۳۶۳۷ اور آگے)

رومی صبح کو "حشرِ اصغر" کا نام دیتا ہے:

ہست ما را خواب و بیداریٔ ما — بر نشانِ مرگ و محشر دو گوا
حشرِ اصغر حشرِ اکبر را نمود — مرگِ اصغر مرگِ اکبر را زدود (پنجم: ۱۷۸۷-۱۷۸۸)

رومی مثنوی میں روح کی ملکوتی اصل کے نظریے، اس کے مادی دنیا میں نزول، زمین پر اس کی زندگی اور بالآخر اس کے اپنے اصل مقام کو واپسی کے بارے میں تفصیل سے لکھتا ہے۔ اس نظریے کا ماخذ شاید نوفلاطونی اصولِ صدور اور ارسطو اور پلوطینس کی نفسیات ہو لیکن رومی نے انسان کے تخلیقی ارتقا کے متعلق اپنے خیالات کو جو زور اور جذبہ بخشا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ دنیا اس لیے تخلیق کی گئی تھی کہ دنیا کی روح یعنی انسانِ کامل کی نمو ہو سکے، انسان کا اپنی امکانی قوت کو دریافت کر لینا بھی انسانیت کی بے لوث اور پرخلوص خدمت ہے۔ رومی کہتا ہے کہ راہِ خدا میں تدبیر کر تاکہ امامت میں تجھے نبوت کا درجہ عطا ہو:

مکر کن در راہِ نیکو خدمتے — تا نبوت یابے اندر امتے
مکر کن تا وارہے از مکرِ خود — مکر کن تا دور گردے از حسد
مکر کن تا کمتریں بندہ شوے — در کمے افتے خداوند شوے
روبہے و خدمت اے گرگِ کہن — ہیچ بر قصدِ خداوندے مکن
نعرہ را بگزار زاری را بگیر — رحم سوئے زاری آید اے فقیر (پنجم ۲۶۹-۲۷۴)

رومی کا عقیدہ ہے کہ خاتم الانبیا حضورِ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد ہر زمانے میں ایک قطب پیدا ہوتا ہے جو صداقت اور فریب کے درمیان تفریق و تمیز کا سبب بنتا ہے، جب تک دنیا کو توفیق حاصل ہوگی، آزمائش کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

ہمارا عمل پیہم اُس فریضے کا ثمرہ ہوتا ہے جو ملکوتی آگاہی کا اظہار ہم پر عاید کرتا ہے، وہی انسانی فطرت کی بنیاد ہے، چونکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ دل پر اثر انداز ہوتا رہتا ہے، اس لیے جسم بیکار نہیں رہ سکتا۔ وہ فرماتا ہے کہ گو میں تمہارے راز سے آگاہ ہوں لیکن تم اپنے ظاہری عمل سے اس کا اعلان کر دو